پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی

ضیاء الدین برنی اور اس کا نظریۂ سیاست

(آخری قسط)

ضیاء الدین برنی کے نزدیک وہ حکومت قابلِ تحسین ہے جو حق و صداقت کی ترویج میں کوشاں رہے لیکن حق و باطل اور خیر و شر میں جو شروع ہی سے جنگ ہوتی آئی ہے وہ بھی اس کے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ وہ سلطان محمود کے حوالے سے کہتا ہے:

حق و صداقت کا یہ مطلب نہیں کہ باطل یکسر مٹ جائے اور صرف حق و صداقت باقی رہ جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں"۔ یعنی جب ایک چیز پیدا کی گئی تو اس کی ضد بھی وجود میں لائی گئی۔ جیسا کہ سچائی کا متضاد جھوٹ، اور امن کی متضاد بدامنی، خیر کا متضاد شر، عبادات کا متضاد گناہ اور اطاعت کی متضاد سرکشی ہے۔ اسی طرح دن کے ساتھ رات، روشنی کے ساتھ تاریکی، آسمان کے ساتھ زمین، مذہب کے ساتھ لامذہبیت اور توحید کے ساتھ شرک وجود میں آیا جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

یہ جوڑے قدرت کی طرف سے ہیں، اس لیے ممکن نہیں کہ ایک باقی رہے اور اس کا متضاد مٹ جائے۔ اس تضاد کو مٹانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ برنی کہتا ہے، اگر تمام مسلمان حکمران مل کر بھی باطل کو، جو کفر، بدامنی اور بدی پر مشتمل ہے، مٹانے کی کوشش کریں اور صرف حق کو، جو اسلام، امن، اطاعت اور نیکی پر مشتمل ہے، قائم رکھنے کی جد جہد کریں تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے، کیونکہ سچائی جھوٹ سے، نیکی بدی سے، اسلام کفر سے، اور توحید شرک کی وجہ سے نمایاں ہوتی ہے۔ تضاد ہی کی بدولت متضاد چیزوں میں تمیز ہوتی ہے۔

اسلام کی سرشت بھی مجموعۂ اضداد ہے۔ اس میں نیکی بھی ہے اور بدی بھی۔ کوئی شخص اسلام پر کاربند ہوگا یا کفر پر، نیک ہوگا یا بد، صحیح راستے پر چلے گا یا غلط راستے پر، عبادت گذار

یا گنہ گار، یہ سب کاتب تقدیر نے ابتدائے آفرینش ہی سے لوحِ محفوظ پر رقم کر دیا ہے، اس لیے بدیوں اور گناہوں کا قلع قمع کرنا حدِ بشریت سے خارج ہے۔

جب ہم حکومت میں حق و صداقت کے قیام کی ضرورت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ہے کہ ایسے وسائل اختیار کیے جائیں کہ حق باطل پر غالب رہے اور باطل حق پر غالب نہ آنے پائے۔ اگر بادشاہ کا نظریہ یہ ہو کہ دین اور ملک کا بنیادی مقصد پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کی عظمت کو نمایاں کرنا ہے تو وہ نیک نیتی، مستحکم ارادے، اور تمام وسائل کو بروئے کار لاکر جدوجہد کرتا ہے جس سے مرکز، صوبوں اور شہروں وغیرہ کے لوگوں کو احکامِ خیر پر چلنے اور شر سے پرہیز کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس کے نتائج دور رس ہوتے ہیں، اسلامی روایات فروغ پاتی ہیں، اطاعت نمایاں ہوتی ہے، بدی اور بداعمالی دب جاتی ہے، عدل اور شفقت کا دور دورہ ہوتا ہے، ظلم و تشدد کی قوتیں معطل ہو جاتی ہیں، علومِ شریفہ کی طرف میلان ہوتا ہے، بدعات سے طبائع اجتناب کرتی ہیں، دیندار اور حامیانِ دین بلند مراتب حاصل کرتے ہیں، بدنیت، بداعتقاد، بدعات جاری کرنے والے اور دینِ اسلام کے دشمن ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ شریعت نے جن باتوں سے منع کیا ہے وہ پس پردہ چلی جاتی ہیں۔ خدا اور رسولؐ کی محبت دلوں میں راسخ ہوتی ہے اور دنیا کی محبت، جو صداقت کے راستے کی رکاوٹ ہے اور بدی کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتی ہے، کم ہو جاتی ہے۔ عاقبت کی طرف رجوع زیادہ ہوتا ہے۔ لذاتِ دنیا سے طبیعتیں نفور اور توبہ کی طرف مائل ہوتی ہیں، خیر کا عنصر بدی کے عنصر پر غالب آتا ہے، سچے لوگوں کی عزت ہوتی ہے اور جھوٹوں کو ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امرا ارشادِ خداوندی کے مطابق اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ خیرات کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ رفاہ عام کے کام کرتے ہیں۔ فلاحی اداروں کا قیام عمل میں لاتے ہیں، غربا اور ناداروں کو بے بسی کی موت نہیں مرنے دیا جاتا بلکہ انھیں جینے کے سامان مہیا کیے جاتے ہیں۔ دیانتداری کی روزی کمانے کے وسائل بڑھتے ہیں اور روزی کے وسائل، جن سے منع کیا گیا ہے یا جنھیں مشتبہ قرار دیا گیا ہے، کم ہو جاتے ہیں فریب اور ریا کی ہر جگہ مذمت ہوتی ہے، اچھے افعال اور رفاہ عامہ کے کاموں کی قدر ہوتی ہے۔

لین دین سچائی کے اصول پر ہوتا ہے۔ نرخوں کے بڑھ جانے اور ذخیرہ کرنے کا رجحان جاتا رہتا ہے۔ دکاندار لوگوں کو دھوکے اور فریب کا شکار نہیں بناتے بلکہ ناجائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور چیزوں میں ملاوٹ کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں، اطاعت گذار امن چین کی نیند سوتے ہیں، سرکش اور فتنہ پسند لوگ حکمران کے قہر و سطوت سے ہراساں رہتے ہیں، ہمہ گیر امن و سکون قائم ہوتا ہے اور لڑائی جھگڑے کا خیال نہیں آتا۔ طاقت ور کمزور پر غالب نہیں آسکتا۔ بغاوت کا مواد لوگوں کے دماغوں سے خارج ہو جاتا ہے، بدگوئی اور بداندیشی کی جگہ خلوص، ایمانداری اور نیک اندیشی لے لیتی ہے۔ مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور ضیافت خانے آباد ہوتے ہیں۔ اولاد ماں باپ کی فرماں بردار ہوتی ہے۔ محسنوں کا حق مہر و محبت سے ادا کر دیا جاتا ہے، اور لوگ قول کے سچے ہوتے ہیں۔ غربا اور حاجت مندوں کو ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ یتامیٰ اور بیوگان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ مسافر بھوکے نہیں سونے پاتے اور انھیں وطن کو واپسی کے لیے وسائل مہیا کیے جاتے ہیں

حق و صداقت قائم کرنے کی ذمے داری بادشاہوں پر ہے۔ اگر بادشاہ ایمان کی حفاظت کو اپنا شعار نہ بنائیں اور شریعت اسلامی کے مطابق احکام نافذ نہ کریں تو لوگوں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور وہ مذموم پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ بدکاری کے اڈے قائم ہوتے ہیں، ہر گلی کوچے میں جوئے کا کاروبار شروع ہوتا ہے۔ گانے بجانے والوں کی منڈلیاں منظم ہونے لگتی ہیں۔ بادشاہ اگر صرف اسی پر مطمئن ہو جائیں کہ شنیع کاروبار کرنے والوں پر ٹیکس لگا دیں تو اس سے انوام و نواہی کا کوئی پاس نہ ہوگا۔ اسلام کے وقار پر ضرب پڑے گی اور حق و صداقت کا معمول جاری نہ رہ سکے گا۔

عفو و تعذیر میں توازن

ملک کے نظم و نسق میں جب کوئی خلل آتا ہے یا معاشرے میں کوئی خرابی رونما ہوتی ہے یا کوئی بے راہ روی دیکھنے میں آتی ہے تو لازم آتا ہے کہ اس کے ذمے دار لوگوں کا محاسبہ کیا جائے۔ ان خرابیوں کے سدباب کے لیے عفو و تعذیر دونوں موقع اور محل کے مطابق مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

غافر الذنب وقابل التوبۃ (خدا) گناہوں کا معاف کرنے والا، توبہ کو قبول کرنے
شدید العقاب" والا اور سزا دینے میں سخت ہے۔

علمائے دین کا کہنا ہے کہ جو حکمران اس آیت کے معنی اچھی طرح سمجھتا ہے، وہ یہ بھی جاننے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ عفو اور تعزیر کے لیے مناسب موقع کونسا ہے۔ ایسے حکمران کے زمانے میں نظم ونسق قائم رہے گا اور امن وامان کا دور دورہ ہو گا۔

برنی عفو اور تعزیر میں توازن پیدا کرنے کے متعلق لکھتا ہے:

سلطان محمود فرماید: ای فرزندانِ محمود بدانید کہ عفو و تجاوز و اغماض و ستر در معاملات جہانداری از فرائض و لوازم است۔ اگر بادشاہ در جرائم رعیت عفو نہ فرماید و از گناہان اعوان و انصار دولت ستر و اغماض نکند و از سر تقصیرات و اہمال و اغفال و خطا و سہو نگذرد، چنانچہ کسی از رعایای ملک او را بر او امید خیری نماند.... و دولت را پائیداری نباشد۔ ہم چنیں اگر بادشاہ سیاست و حدود و تعزیرات و بند و زنجیر متعدیان و متسلطان و فتنہ انگیزان و دزدان و مکابرہ گران و غاصبان و متغلبان و بی باکان و بی شرمان و بی عاقبتان و بد اندیشان در کار ندارد، آدمی ہر آدمی را بخورد و مالی و ملک و زن و بچہ کسی سلامت نماند۔

برنی یہ بھی لکھتا ہے کہ بادشاہوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ لفظ "سیاست" سے مراد ملک کے جملہ انتظامات کو بہتر بنانا ہے۔ اس کے لیے مختلف طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف کی بنا پر زندگی گزاریں۔ مرکز میں راستی کا دور دورہ ہو اور عوام و خواص مطمئن رہیں۔ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے محفوظ و مصئون ہو۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ لوگوں سے احسان و مروت اور خلوص و مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ تعمیری کاموں پر انعام و اکرام بھی دینے چاہیئں۔ اس طرح بہت سے آدمی صحیح راستے پر چلیں گے اور خوشحال بھی ہوں گے۔ نظم ونسق کی اصلاح میں اس طریق کار کو بھی "سیاست" کہتے ہیں۔ سیاست کی دوسری قسم یہ ہے کہ جرائم پسند لوگوں کو تنبیہ، تادیب اور سرزنش کے ذریعے راہ راست پہ لایا جائے۔ ضروری ہو تو ان کی املاک ضبط کر لی جائیں۔ اس سیاست سے بہت سے

گمراہ لوگوں کی اصلاح ہو جائے گی، اور دوسرے لوگ ان کے انجام کو دیکھ کر عبرت پکڑیں گے سیاست کی ایک اور قسم قید و بند اور نظر بندی سے متعلق ہے۔ یہ تعذیر ان لوگوں کے لیے ہے جو لگان روکیں یا لگان روکنے کی خواہش کریں۔ سیاست کی ایک اور قسم کا تعلق جلا وطنی سے ہے۔ یہ سزا ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو سیاسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جب تک تادیب و تذلیل، قید و بند اور جلا وطنی کی سزائیں موثر ثابت ہوتی ہیں کسی کا خون نہ بہایا جائے۔

خدا ترس بادشاہوں کا کہنا ہے کہ اگر عفو اور تعذیر ساتھ ساتھ نہ چلیں تو بادشاہت قائم نہیں رہ سکتی۔ دور اندیش بادشاہ وہ ہوتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ عفو کا وقت کونسا ہے اور تعذیر کا کونسا۔ وہ جب احکام جاری کرتا ہے، نظم و نسق کے استحکام کا خیال اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کو مہر و محبت سے صحیح راستے پر لایا جا سکے لیکن حکمران اس پر جبر و تشدد کرے تو یہ کوئی سیاست نہیں، نہ اسے صحیح راستے پر ڈالنے کی ہی یہ تدبیر ہے۔ بلکہ اس سے بدنظمی اور بے دلی پھیلتی ہے اور اگر امور سلطنت کو درست طور پر چلانے کے لیے کسی کو محبوس یا جلا وطن کرنے یا سزائے موت دینے کی ضرورت ہو، لیکن بادشاہ اس کی تالیف قلب کرنا چاہے، اسے کسی صوبے کا حاکم بنا دے یا دار السلطنت میں کوئی اہم عہدہ دے دے، اس پر انعام و اکرام کی بارشیں کرے تو ایسی سیاست مملکت کی بنیادیں منہدم کرنے کا موجب بنے گی۔

مجرموں کو سزائیں دینے کے بارے میں برنی نے یہ لکھا ہے کہ:

۱۔ شریعت کے مطابق دی جانے والی سزاؤں میں بادشاہ کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ سیاسی جرم میں سزائے موت صرف انتہائی جرم کی پاداش میں دینی چاہیے۔ فقیہانِ اسلام نے بتایا ہے کہ سیاسی سزائیں دینے کی ذمے داری خدا کے حضور بادشاہ پر ہو گی اس لیے بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ ان حالات کا یقین کر لے جن کے تحت وہ سزائے موت دینے میں حق بجانب ہو گا۔ برنی نے اس اصول پر زور دیا ہے کہ سزا اس قدر دینی چاہیے جو ملکی مفاد کے لیے ناگزیر ہو۔ سزائے قتل کی گراں باری کا ذکر برنی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

نزدیک محمود تنعم ہمہ ملک دنیا بگراں باری ایں بار نمی رسد و بقطرہ ای کہ خون موحد بناحق ریختہ شود، و طمطراق بادشاہی و کوکبہ و دبدبہ جہانداری نمی ارزد۔

سزائے قتل تمام تنعمات دنیا سے زیادہ گراں بار ہے۔ کسی موحد کے خون کا ایک قطرہ ناحق گرایا جائے تو شوکت شاہی اور دبدبۂ بادشاہی اس کی قیمت نہیں ادا کر سکتی۔

۳۔ غیر مسلم رعایا کے جرائم پر ان کی روایات کے مطابق سزا دی جائے۔

۴۔ بیت المال کی رقم غبن کرنے والے مجرم سے وہ رقم حاصل کی جائے۔ اگر وہ حیلہ تراشی کرے تو اس کے ساتھ سخت سلوک کرنا چاہیے۔ لیکن اسے قید و بند کی سزا دیتے ہوئے شرعی حدود کو نظر میں رکھنا ہوگا۔

ضوابطِ سلطنت اور وقت کے تقاضے

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مملکت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مخصوص علاقائی حالات کی وجہ سے تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہیں۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں جب ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک میں اسلامی علم لہرایا تو خلفا کو بعض نئے قوانین بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن یہ قوانین بھی شریعت اسلامی کی روشنی میں وضع ہوتے اور شریعت ہی کی روشنی میں ان کا نفاذ ہوتا تھا۔ بنو امیہ کے زمانے میں اگرچہ نام کو تو خلافت تھی لیکن حقیقت میں وہ بادشاہت کی ہیئت اختیار کر چکی تھی۔ خلیفہ اپنا جانشین نامزد کرتا تھا۔ خلیفہ کی حیثیت مختار کل کی ہوتی تھی۔ یہ زمانہ پُرزور مذہبی اختلافات کا زمانہ تھا، جنھیں بزور شمشیر دبا دیا گیا۔ بہرحال سخت گیرانہ مسلک نے دنیا کے مسلمانوں کو متحد رکھا۔ ان کے بعد عباسیوں کا دور آیا۔ یہ دور افکار و اجتہاد کا دور تھا۔ اسلام بدستور پھیل رہا تھا۔ اسلامی حکومت نئے معاشرتی مسائل سے دوچار ہوئی۔ جگہ جگہ مقامی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ خلفا اور دوسرے حکمرانوں نے قرآن و سنت کو مشعل راہ تو بنایا لیکن علما اور دانشوروں کے مشورے سے ملکی حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے قوانین بھی وضع کیے۔ گویا ان قوانین میں شریعت اسلامی سے روشنی حاصل کرنے کے ساتھ اجتہاد اور استحسان کے

تکریبے سے بھی کام لیا جانے لگا۔ اس کے باوجود سلاطین، اسلامی حکومت کے سرچشمہ یعنی خلافتِ بغداد سے اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتے تھے۔ محمود غزنوی نے اپنی فتوحات کے باوجود اپنی حکومت کو خلیفۂ بغداد سے تسلیم کرانا چاہا اور یمین الدولہ کا لقب حاصل کیا اور محمد بن تغلق نے خلافت سے اپنی عقیدت برقرار رکھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ خلافت جن اصولوں پر قائم تھی مسلمان حکمرانوں کو وہ بہت عزیز تھے۔ بہرحال ان حکمرانوں نے جو ضوابط نافذ کیے ان میں شریعت کی پیروی کے ساتھ ساتھ وقتی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا اور شریعت کے علم بردار علما اور ملکی دانش وروں نے سیاسی ڈھانچے میں اہم تبدیلیاں کیں۔

برنی ملکی سیاست میں شریعت کو بہت اہمیت دیتا ہے لیکن اس کا نظریہ یہ ہے کہ ملکی قوانین دانش وروں کے مشورے سے مرتب ہونے چاہئیں تاکہ عوام میں مقبولیت حاصل ہو۔ اس نظریے کو وہ سلطان محمود کی نصیحت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

فرزندان محمود! تمھیں جان لینا چاہیے کہ حکومت گراں بار ذمے داری ہے۔ کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ معاشرتی امور، لوگوں کا باہمی لین دین، ان کے اختلافات، اور تنازعے فرد واحد کی رائے، فیصلے، حکم اور رہنمائی پر موقوف ہو، اور صحیح طور پر انجام بھی پائیں۔ نظم و ضبط مستحکم بنیاد پر قائم ہو۔ احکام شریعت کی پیروی ہو۔ اسلامی روایات فروغ پائیں مرکز میں حق و انصاف کا اصول رائج ہو۔ فضائل نمایاں اور رذائل معدوم ہوں۔ عدل و احسان عام ہو اور ظلم و تشدد کا قلع قمع ہو جائے۔ ملک میں غلّہ فراواں ہو، اور مویشیوں کو مناسب چارہ ملے۔ مصائب کا سامنا کم از کم ہو اور رحمتِ خداوندی سایہ فگن رہے۔ نیک اعمال کے اچھے ثمرات ملیں لیکن یہ عظیم امور، جو جہانبانی اور جانداری سے متعلق ہیں اس وقت تک انجام نہیں پا سکتے جب تک کہ قوانین دانشوروں کے باہمی مشوروں سے وضع نہ کیے جائیں۔ ان کے بغیر نہ حکومت کو استحکام حاصل ہوتا ہے نہ رعایا کے مفاد ہی کی حفاظت ہوتی ہے۔

نظم و نسق اور حکومت کی حکمتِ عملی کے لیے متعدد ضابطوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکیں۔ پس دانا حکمران کا یہ فرض ہے کہ ایسے ضوابط

نافذ کرے جو عدل و رحم پر مبنی ہوں اور مثالی ضابطوں کا درجہ حاصل کر سکیں۔

اگر بواسطۂ تغیر زمان و اختلاف اوان نتواند کہ ضوابط متقدمان را ملتزم شود، باید کہ بتوفیق اندیشہ ہای کامل العقلاں کہ بتجارب ملکی پیراستہ و تربیت سرآمدگی سرافراز گشتہ باشند، ضوابطی کہ مناسب اوان و زمان و عہد و عصر او باشد، وضع کند و آنرا ملتزم گردد و بسی فکر را در کار باید داشت، تا ضوابطی کہ ملایم عہد و عصر بود و از ملازمت آں مقصود کار ملکی برآید، وضع شود۔

یعنی اگر وقت کے نئے تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر پرانے ضابطوں کا نفاذ ممکن نہ ہو تو وہ ایسے دانش وروں کے مشورے سے، جنھیں سیاست کا تجربہ ہو، نئے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرے۔ ایسے قوانین مرتب کرنے کے لیے بہت غور و فکر کی ضرورت ہے جن سے موجودہ زمانے اور مستقبل کے تقاضے پورے ہو سکیں۔

سلطان محمود کے حوالے سے برنی کہتا ہے، اگر تم نئے قوانین وضع کرنا چاہو تو ذیل کی باتوں کو ان کی بنیاد بناؤ:

۱۔ حکومت کے قوانین ایسے ہوں جن سے احکام شریعت کی نفی نہ ہو، نہ ان سے دینی امور میں کسی قسم کی مداخلت ہو۔

۲۔ قوانین ایسے ہوں جن سے خواص کا میلانِ اطاعت اور وفاداری بڑھے اور عوام پُرامید رہیں۔ نیک لوگ مطمئن رہیں اور بدکردار لوگ ہراساں رہیں۔

۳۔ ان قوانین کی اسناد اسلامی حکمرانوں کے قوانین سے حاصل کی جائیں۔ یاد رہے کہ بے دین بادشاہوں کی روشوں اور ظالم بادشاہوں کی روائتوں کا احیا نہ ہونے پائے۔

۴۔ اگر ان ضوابط میں کوئی بات ایسی ہو جو سنت کے خلاف ہو اور لوگوں میں نیکی کے فقدان اور کمزوری ایمان کے پیش نظر ان کا نفاذ ضروری ہو تو ایسا نہ ہو کہ تم انھیں درست اور جائز سمجھنے لگو اس کے بدلے میں تم کافی خیرات دو اور جو ناجائز بات تم کر رہے ہو، اس سے ڈرتے رہو۔ تم پر یہ واضح رہے کہ ایسے ضوابط کا نفوذ شریعت کے اس

حکم کے تحت ہوتا ہے کہ اشد ضرورت کے وقت ممنوع چیزیں بھی جائز ہو سکتی ہیں۔

برنی اس مسئلے پر مزید زور دینے کے لیے لکھتا ہے:

بدانید کہ وضع ضوابط جہانداری کاری بس مشکل است و اوضاع جدید کہ برحسب مشاہدہ داوان و زمان نکنند، استقامت نپذیرد و در ظواہر و بواطن مردماں جای نگیرد و تا واضعان بکمالات عقل و فراست و درائت و فطانت و تجارب گوناگوں آراستہ نباشند و برامزجہ و ضوابط سلاطین سلف واقف نبوند و مع ذلک۔

یعنی ملک کے لیے قانون وضع کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ایسے قوانین، جو ضرورتِ وقت کے مطابق ہوں بآسانی نافذ نہیں ہو سکتے جب تک قانون ساز عقل و دانش، علم اور سیاسی شعور سے آراستہ نہ ہوں اور گزشتہ زمانے کے قوانین پر عبور نہ رکھتے ہوں، عوام ان کے بنائے ہوئے قوانین کو قبول نہیں کریں گے۔

نیز برنی کہتا ہے کہ قانون سازوں کے لیے لازمی ہے کہ ان کا جذبۂ غضب، ہوش و فرزانگی کے تابع ہو۔ دینی محبت، دنیاوی محبت پر غالب ہو۔ حسد و رشک سے وہ بالاتر ہوں ان کے دلوں میں حکمراں اور رعایا کی بہبودی کا خیال ہو۔ جس طرح وہ اپنی نیکی اور بدی میں تمیز کر سکتے ہیں، انھیں یہ احساس بھی ہونا چاہیے کہ مملکت کی اچھائی کس میں ہے اور برائی کس میں۔ ملک و قوم کا مستقل فائدہ کس چیز میں ہے اور وقتی فائدہ کس چیز میں۔ انھیں بہر حال مستقل فائدوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہ شرائط پوری ہوں تو قانون ساز جو قوانین وضع کریں گے مستحکم اور قابل عمل بھی ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر قانون ساز نااہل، سیاسیات سے بے بہرہ اور خواہشات کے بندے ہوں گے اور وقتی فائدے ان کے پیش نظر رہیں گے تو ان کے وضع کردہ قوانین مستحکم نہیں ہوں گے، بلکہ وہ خوش حالی کے بجائے انتشار اور بدامنی پیدا کرنے کے موجب ہوں گے۔

برنی یہ بھی لکھتا ہے کہ ایسے خودسر بادشاہ بھی ہو گزرے ہیں کہ بزعم خویش خدائی کا دعویٰ کر کے روسیاہ ہوئے۔ اپنے آپ کو مالکِ ارض سمجھا۔ قوانین وضع کیے لیکن خدا، انبیائے کرام اور یومِ حساب کو خاطر میں نہ لائے۔ ان کا پہلا اصول یہ تھا کہ ہر شخص ہر بات میں

ان کی اطاعت کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ہزاروں اشخاص، اگر نافرمان ہیں تو انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ دوسرا مذموم طریق کار یہ تھا کہ جس شخص پر خوش ہوئے اس پر خزانہ نچھاور کیا جاتا خواہ وہ دو کوڑی کا آدمی ہوتا اور ہزاروں اشخاص جو سزائے موت کے مستحق ہوتے انھیں محض ذاتی مفاد کی غرض سے آزاد کر دیا جاتا لیکن اس کے برعکس بے قصور لوگوں اور گروہوں کا خون بہانے میں دریغ نہ کیا جاتا۔

ایسی مذموم حکمت عملی کے ذریعے جابر اور شقی القلب بادشاہ بھی حکومت تو چلا لیتے تھے لیکن یہ حکومت ناپسندیدہ اور کم مدت ہوتی تھی۔ ان کے برعکس دینی حکمرانوں کا مسلک ان سے یکسر مختلف تھا کیونکہ مسلمان حکمران عقبیٰ کو دنیا پر فوقیت دیتے ہیں اور ان کے نزدیک کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ بلاوجہ گرانے والا یوم حساب کو عذاب الیم کا مستوجب ہوگا۔ بعض احادیث شخصی حکومت کے صریحاً خلاف ہیں اس لیے لازم ہے کہ ملکی قوانین وضع کرنے کی ذمے داری دانش وروں کو سونپی جائے، ایسے دانش وروں کو جو فہم و فراست میں یکتا ہوں۔ قوانین جو وہ وضع کریں ایسے ہونے چاہئیں کہ امور و معاملات احسن طریقے سے انجام پائیں اور ملک میں امن و امان قائم رہے۔ نیز اسلامی عقائد پر بھی زد نہ پڑے اور عقبیٰ کے ثواب سے بھی محرومی نہ ہو۔

ہر دانا اور مشترع حکمران کو سلطان محمود جیسے جہانداری کا طویل تجربہ تھا، کے مذکورۂ بالا الفاظ پر غور کر کے اپنی روحانی کمزوریوں کا تجزیہ کرنا چاہیے تب وہ محمود کی نصیحت کی اہمیت سمجھ سکے گا۔

بادشاہ کے جاہ و جلال کو برقرار رکھنے اور حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے قدیمی دانشوروں نے عوام و خواص، جن میں وزرا، امرا، افسران، اور عمائدین سے لے کر پاسبان اور غلام تک شامل ہیں، کے معاملات سلجھانے کے لیے اصول و قواعد مرتب کیے جو اب تک رائج ہیں۔ سلطان محمود نے ان ضوابط کے بارہ میں کہا کہ:

ہم محمد الرسول اللہ کے دین کے پیرو ہیں جو خاتم النبیین ہیں۔ میں جو قانون منظور کرتا ہوں میرے پیش نظر یہ اصول ہوتا ہے کہ شریعت رسول اللہ کی پیروی ہو اور کسی قانون سے

شریعتِ اسلامی پر زد نہ پڑے۔

اصول جہانداری جو اس نے قدرخاں کو بتائے درج ذیل ہیں:

۱۔ میری حکومت کا پہلا اصول جس پر میں ۳۸ سال سے عمل پیرا ہوں، یہ ہے کہ شریعت کے احکام مملکت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دوں اور اسلام کی روشنی سے پوری مملکت کو منور کر دوں۔

۲۔ میں احکام نافذ کرنے کی ذمے داری پرہیزگار، متشرع اور خداترس لوگوں کے سپرد کرتا ہوں، کسی عیار، فریبی، حریصِ دنیا یا بدعقیدہ شخص کو عدل و انصاف کا منصب نہیں دیتا۔

۳۔ غیر دینی امور صرف اعلیٰ نسب کے لوگوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔

۴۔ جس شخص کو میں جانچ پرکھ کے بعد بلند منصب پر فائز کرتا ہوں، معمولی لغزش پر اسے ذلیل و رسوا نہیں کرتا۔ کسی شخص کے حسنِ خدمت یا اطاعت شعاری کا صلہ ضائع نہیں ہونے دیتا۔

۵۔ میں اپنی اولاد، حامیوں اور مملکت کے بہی خواہوں کے ساتھ اس طرح رابطہ رکھتا ہوں کہ نہ صرف میرے وقار میں کمی نہیں آتی بلکہ ان کی اطاعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۶۔ ہر سال میرے خزانے میں سونے چاندی کے انبار لگتے ہیں، اور وہ میری موجودگی میں فوج میں تقسیم ہوتے ہیں۔ لشکر کے اخراجات میں میں نے کبھی کمی نہیں کی، نہ ایسا کبھی ارادہ ہی کیا ہے۔ جہاں تک ممکن تھا میں نے کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ کسی سپاہی کی تذلیل ہو۔

۷۔ میں، عقل و دانش، عدل و انصاف، زہد و پاکیزگی، صلاحیتِ کار، نیکی کے سلوک صداقت اور اچھے کردار کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف ہوتے ہیں، انھیں میں کسی درخواست یا سفارش کے بغیر بلند مرتبے پر فائز کرتا ہوں۔ انھیں پنشنیں، تحفے، دیہات اور باغات بطور جاگیر دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میری مملکت ایسے نیک کردار لوگوں سے آراستہ ہے۔

۸۔ میں اپنے رشتے داروں، گورنروں اور علاقائی حکمرانوں سے لے کر زمینداروں، دیہات کے سرکردہ لوگوں اور عوام تک کے حالات کی پوری خبر رکھتا ہوں جس کا یہ نتیجہ

ہے کہ صدق و دیانت سے احکام نافذ کرنے میں مجھے مدد ملتی ہے۔

۹۔ امور سلطنت پر توجہ دیتے ہیں، میں مناسب وقت دیتا ہوں تاکہ میری زندگی بے کار باتوں میں ضائع نہ ہو اور کام کی باتیں ادھوری نہ رہ جائیں۔

۱۰۔ کسی مہم کا ارادہ کرتے ہوئے، اسے عملی جامہ پہنانے سے پہلے میں اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہوں، اور مشیروں کے مشورے حاصل کرتا ہوں، اس کے بعد اپنے ارادے کو مستحکم کرتا ہوں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا میری مہموں میں مجھے بآسانی کامیابی بخشتا ہے۔

۱۱۔ میں نے ہمیشہ اپنی اطاعت گزار اور فرماں بردار رعایا کے ساتھ شفقت کا سلوک کیا، پُرامن شہریوں اور نیک کردار لوگوں کی اپنے آغوش شفقت میں پرورش کی۔ خراج دھول کرنے میں، میں نے ایسی سختی کبھی نہیں کی کہ رعایا مفلس و نادار ہو جائے، لیکن ایسی نرمی بھی نہیں کی کہ دولت مند اپنی دولت کی وجہ سے سرکش اور باغی ہو جائیں۔ میں نے بے باکوں، عاقبت نااندیشوں، بہائم صفت لوگوں، اندھے مہم بازوں، ناخدا ترسوں، ریاکاروں، دھوکے بازوں بے حیاؤں، گستاخ اور سنگ دل لوگوں سے ضرور سختی کی ہے۔

۱۲۔ میں خدا، رسول اکرمؐ اور یوم حساب کے خوف سے اور اس ڈر سے کہ میرے مخالف قیامت میں میرا دامن نہ پکڑیں، کسی رات کو بھی امن چین کی نیند نہیں سویا۔

۱۳۔ سرکاری مال غبن کرنے والوں اور واجب الادا رقوم ادا نہ کرنے والوں کو میں نے کبھی اس طرح تباہ نہیں کیا کہ وہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں۔ جرمانہ کرنے اور جائداد ضبط کرنے میں میں نے ہمیشہ شرعی حدود کو پیش نظر رکھا۔ میری مملکت میں کبھی کوئی ذمے دار عہدہ خالی نہیں رہا۔

۱۴۔ میں نے کبھی کسی وجہ سے حق و صداقت کا پہلو نہیں چھوڑا۔ یہ اصول تمام ضابطوں کی بنیاد ہے۔ پس خداوند تعالیٰ نے میری مہموں میں ازراہ عنایت مجھے ہمیشہ کامیابی عطا کی

۱۵۔ میں نے ان اصولوں پر بڑی احتیاط سے عمل کیا اور ان سے روگردانی کا مجھے کبھی خیال نہیں آیا۔

برنی نے یہ شکایت ضرور کی ہے کہ اس کے زمانے کے سلاطین نے اسلامی نظریات

پوری طرح نہیں اپنائے لیکن اسے یہ خیال بھی ہے کہ اس ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور رعایا کو برابر کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں، اس لیے عوام کے مفاد کے پیش نظر قوانین مرتب ہونے چاہئیں۔ چنانچہ علاء الدین خلجی نے لادینی معاملات کے مطابق قوانین نافذ کر کے رعایا پروری کی اور ہندوؤں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا۔[۵۷]

عالی ہمتی بادشاہ کی اہم صفت ہے

برنی نے بادشاہ کی ایک اہم صفت "عزم درست" بتائی ہے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ دوسری اہم صفت اس کے نزدیک "عالی ہمتی" ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی نصیحت کی روشنی میں وہ لکھتا ہے:

۱۔ عالی ہمتی ایسا وصف ہے جس کے ذریعے بادشاہ کو دنیا کے حکمرانوں میں ممتاز مقام حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ عالی ہمت بادشاہ فیاض طبع ہوتا ہے۔

۳۔ بخل عالی ہمتی کی ضد ہے۔

محمود غزنوی کی نصیحت کا سہارا لیتے ہوئے برنی لکھتا ہے:

اے فرزندانِ محمود و شاہانِ اسلام تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ عالی ہمتی بادشاہ کا بہت بڑا وصف ہے۔ بادشاہت کے اخلاقی محاسن کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ بادشاہت یعنی نیابت الٰہی اور عالی ہمتی دونوں لازم ملزوم ہیں۔ عظیم بادشاہوں کا قول ہے کہ جو بادشاہ علو ہمت سے متصف نہیں ہوتا، اس کی سیاسی سیادت کو لوگ دل سے قبول نہیں کرتے۔ وہ نہ عوام کی اطاعت، خلوص اور ہمدردی حاصل کر سکتا ہے اور نہ رہنماؤں اور مشاہیر کو اپنے حلقۂ ارادت و خدمت سے وابستہ رکھ سکتا ہے۔ دنیا میں برتری حاصل کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

خداوند بزرگ و برتر نے دنیا میں انبیائے کرام مبعوث کیے جو علم و دانش میں کامل تھے۔ ان کا کردار اور مسلک حیات بے داغ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوئیں۔ بادشاہت عطیۂ خداوندی ہے اور امور سلطنت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بادشاہانِ اسلام جوانمردی، فصاحتِ بیان، قوت تمیز اور ایمان راسخ ایسی

صفات کے حامل ہوں۔ مشاہیران اسلام کا قول ہے کہ بادشاہت کفر اور عصیان کے ساتھ تو قائم رہ سکتی ہے لیکن بخل، ناانصافی، پست ارادے اور گھٹیا کردار کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتی۔

افلاطون، ارسطو، دیوجانس، سقراط اور قدیم و جدید دانش ور متفق ہیں کہ بادشاہت عالی ہمتی کی مظہر ہے جسے پست ارادے کے لوگ حاصل نہیں کر سکتے۔

۲۔ اگر بادشاہ عالی ہمت، اولوالعزم اور عظمت کے طالب نہ ہوں تو وہ کماحقہ بادشاہت کے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ ان کے تحائف (فیاضانہ کارناموں کے اثرات) لوگوں تک نہیں پہنچیں گے۔ اگر ان کے یہ تحائف مملکت بھر میں نہ پہنچ سکیں تو عوام و خواص کے دلوں میں ان کی عظمت و شوکت کا احترام باقی نہ رہے گا۔ جس طرح بادشاہ حکومت کی صلاحیت کی بدولت دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے، اسی طرح اس کی فیاضی ـــــ جرمانوں کی معافی، گراں قدر اور متعدد تحائف کی پیش کش وغیرہ سے بھی اسے امتیاز حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ علو ہمت، عظمت اور عظمت کی طلب اگر ہو تو بخل، خست اور حرص کی گنجائش نہیں رہتی۔ حکمرانی کے لیے یہ ضروری ہے کہ بادشاہ کا رعایا پر قابو رہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دبدبہ، قوت و شوکت اور جاہ و جلال میں وہ یگانہ ہو۔ یہ فوقیت کم اندیش، بخیل، خسیس اور پست ارادہ حکمرانوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بخیل ہمیشہ ناقابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں اور رعایا کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات موج زن ہوتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ احکامِ شاہی خاطر خواہ طور پر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس بادشاہ کا وقار جس قدر بڑھے گا، اتنی ہی احکامِ شاہی نافذ کرنے میں آسانی ہوگی اور بادشاہ کے احکام کا نفوذ جتنا موثر ہوگا، اتنی ہی رعایا خوش حال ہوگی۔

برنی نے بعض دانش وروں کے حوالے سے عالی ہمت بادشاہ کی گیارہ صفات بیان کی ہیں:

۱۔ اس کی نظروں میں دنیاوی بادشاہت ہی زندگی کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ اس کی کوشش عاقبت سنوارنے پر مرکوز رہتی ہے۔

۲۔ وہ ایک دنیا پر احسان کرنا چاہتا ہے لیکن کسی دوسرے کا احسان اٹھانا اسے گوارا نہیں۔

۳۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ملکی فلاح کے کام اس کے ہاتھوں سرانجام ہوں لیکن ان کاموں کا وہ کچھ صلہ نہیں چاہتا۔

۴۔ اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ خود کسی سے کچھ نہ لے لیکن پے بہ پے دوسروں کو دیتا رہے۔

۵۔ یہ تمنا بھی اسے ضرور ہوتی ہے کہ نظم و نسق میں اسے دنیا کے حکمرانوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہو اور روحانی اوصاف کاملہ سے بھی متصف ہو۔

۶۔ اسے آرزو رہتی ہے کہ حاجت مند اس کے دسترخوان پر کھانا کھائیں اور اس کے "جامہ خانہ" سے لباس حاصل کر کے پہنیں۔

۷۔ یہ بھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہفت اقلیم کے لیے فرمان اس کی زبان سے جاری ہوں۔

۸۔ اس کی مملکت کتنی ہی وسیع ہو وہ اپنا اثر و رسوخ اور بڑھانا چاہتا ہے۔

۹۔ وہ لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کا وسیلہ بننا چاہتا ہے۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ کوئی اس کے دروازے سے ناامید لوٹے۔

۱۰۔ اس کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اور اس کی حکومت غلاموں کو آزاد کرانے، مقروضوں کو سہولتیں بہم پہنچانے اور پریشان حال لوگوں کو پناہ دینے کا ذریعہ بنے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا، نہ سن ہی سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی مملکت میں مصیبت کا شکار ہو۔

۱۱۔ وہ جب اپنے عروج کو پہنچتا ہے تو پھر وہ ایسی چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کا حصول بظاہر ممکن نہیں اور ناممکن الحصول چیزیں ہمیشہ اسے بے چین رکھتی ہیں۔

عوارض سلطنت

جس طرح جسم انسانی کو عارضے لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح سلطنت کو بھی عارضوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی بدکردار لوگ کھلی چھٹی پا کر امن پسند شہریوں کا جینا وبال

کر دیتے ہیں۔ کبھی خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑتا ہے، کبھی بادشاہ کے ناخوش آیند کردار کی وجہ سے رعایا اس سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ کبھی دشمن ملک پر حملہ آور ہوتا ہے۔ برنی حسبِ معمول سلطان محمود کی نصیحت کا ذکر کرتا ہے:

بادشاہت سب سے بڑی دنیاوی نعمت ہے لیکن ناموافق حالات میں یہ بادشاہت برقرار نہیں رہ سکتی۔ اگر بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے سلطنت کے نظم و نسق میں انتشار پیدا ہو جائے تو اس کے نتیجے میں مختلف عوارض رونما ہونے لگیں گے۔ یہ عوارض بڑھتے جائیں تو سلطنت کا زوال لازمی ہے۔ اگر ان عوارض کے سدِ باب کے لیے موثر تدابیر اختیار کر لی جائیں تو بقا کی امید ہو سکتی ہے۔

دانش وروں کا کہنا ہے کہ اگر بادشاہ ایسے حالات میں اپنے وزرا اور دانش وروں کے مشوروں پر عمل نہ کرے اور غفلت اور لاپروائی کو شعار بنائے تو سلطنت کا زوال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قصرِ سلطنت کی دس اینٹیں گر جائیں تو اس میں شگاف پڑنے لگیں گے اور مزید اینٹیں گرتی جائیں گی۔ اگر بروقت مرمت ہو جائے تو پھر اس میں مزید شگاف نہیں پڑیں گے۔

سلطنت کا ایک عارضہ وبا اور قحط سالی ہے۔ قحط سالی کو دور کرنے کے لیے مناسب ہے کہ ٹیکس اور جزیہ کم کر دیا جائے۔ حکومت ضرورت مندوں کو قرضے دے محتاجوں کو مالی امداد بہم پہنچائے۔ دوسرے ممالک سے غلّہ درآمد کیا جائے، اور کم نرخ پر رعایا کو دیا جائے۔ اگر قحط شدید ہو تو ٹیکس اور جزیہ معاف کر دینا چاہیے۔ حکمران کو اہلِ ثروت کے نام فرمان جاری کرنا چاہیے کہ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیں تاکہ وہ بھوک کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔ لیکن جہاں تک وبا کا تعلق ہے، حکمرانوں کی تدابیر موثر نہیں ہوتیں۔ (موجودہ زمانے میں تو اس کے لیے بھی موثر تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں)۔

سلطنت کا ایک اور بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ بادشاہ جب رعایا سے ناقابلِ برداشت مطالبات کرتے ہیں اور ان کے حصول میں انتہائی اقدامات کرتے ہیں

سزائیں دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے تشدد سے کام لیتے ہیں۔ ملازموں کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں اور ٹیکس کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ ایسے احکام جاری کیے جاتے ہیں جن پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں رعایا اور لشکر بد دل ہو جاتے ہیں بلکہ حکمران سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ سلطنت کا یہ عارضہ ہمیشہ سے بہت خطرناک سمجھا جاتا رہا ہے۔ رعایا کے دل میں بادشاہ سے نفرت پیدا ہو جائے تو ظاہر ہے کہ بادشاہ کو بھی ان سے نفرت ہو جائے گی۔ دونوں جانب سے نفرت کی لہر حکومت کے استحکام کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ نظم و نسق کے بندوبست ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ عناد اور سرکشی بڑھتی ہے۔ شورش کا مواد پکنے لگتا ہے۔ انتشار اور بدامنی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں حکومت کے احکام کا نفاذ ممکن نہیں رہتا اور سلطنت کے ستون متزلزل ہو جاتے ہیں۔

اس عارضے کا علاج بہت دشوار ہے کیونکہ یہ بادشاہ کے اپنے کردار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب بادشاہ کا سلوک رعایا سے ایسا ہو جس کا اوپر ذکر ہوا، تو رعایا اس کے کردار اور مقاصد سے آگاہ ہو جاتی ہے۔ پھر اگر بادشاہ ملکی نظم و نسق بحال کرنے کے لیے اپنے طریق کار میں کوئی خوش گوار تبدیلی پیدا کرنے کی بھی کوشش کرے اور رعایا کی دل جوئی کرنا چاہے تو رعایا کو اس کا یقین نہیں آئے گا اور نفرت جو دلوں میں پیدا ہو چکی ہے، کم نہ ہو گی۔ وہ بادشاہ کے بدلے ہوئے کردار کو فریب دگر سے تعبیر کریں گے۔

ایک اور بہت بڑا خطرہ یہ ہے کہ بادشاہ کا کوئی طاقت ور دشمن حملے کی تیاری کرے اس کے لیے یہ تدابیر تجویز کی گئی ہیں۔ سیاسی وسائل کے ذریعے لڑائی کو ملتوی کیا جائے۔ اگر اس طرح مہلت مل سکے تو حکمرانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فوج اور سامانِ جنگ فراہم کر کے مدافعت کی پوری تیاری کرے۔ وہ نہ صرف خزانے کا مال بے دریغ خرچ کرے بلکہ فوجی مصارف کے لیے رعایا سے مالی امداد طلب کرے اور ہر بالغ مرد کے لیے فوج میں بھرتی ہونا لازمی قرار دیا جائے۔ اناج

کے ذخیرے جمع کرنے اور قلعوں کو مستحکم کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ حملہ آور کی گزرگاہوں پر جو کارآمد چیز ہو، اسے ضائع کر دیا جائے۔ گھر گرا دیے جائیں، تالابوں سے پانی نکال دیا جائے اور چارہ تلف کر دیا جائے۔ بادشاہ کی عزت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے حامیوں، خیر اندیشوں اور بہادر جوانوں کو جمع کرے اور مقابلے کو نکلے اور نتائج سے بے پرواہو کر اپنی زندگی اور مملکت کو خطرے میں جھونک دے۔ حملہ آوروں کے سامنے سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ جہاد اور شہادت پانے کا جذبہ لے کر آگے بڑھیں اور ملک و ملت کی حفاظت کو زندگی کی متاع عزیز پر ترجیح دیں۔ ولولہ، ایمان اور ایثار ہی اسلامی عساکر کے وہ وسائل ہیں جو حملہ آور کو کیفر کردار کو پہنچا سکتے ہیں۔

بادشاہ کے متضاد اوصاف

برنی نے بادشاہوں کے متضاد اوصاف اور ان کی تہذیب و تربیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سلطان محمود کے حوالے سے لکھتا ہے:

اے فرزندانِ محمود اور شاہان اسلام تمھیں جان لینا چاہیے کہ خدا نے انسان میں متضاد اوصاف پیدا کیے ہیں یعنی قبض و بسط، خوف و رجم، سخا و بخل، کبر و انکسار۔ یہ اوصاف ہر انسان کے کردار میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان ان کی تہذیب و تربیت کرے۔ بادشاہ کے لیے بالخصوص ان اوصاف کی تہذیب و تربیت لازم ہے تاکہ وہ نیابتِ خداوندی کا اہل ہو سکے۔ خداوند تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف طبائع، امزجہ اور محرکات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ان کی شکل و صورت اور رنگ اور وضع قطع بھی ایک دوسری سے مختلف ہے۔ اسی طرح ان کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتیں بھی جدا جدا ہیں۔ انسانی سیرتوں میں تفاوت بہت نمایاں ہے۔ اگرچہ تمام لوگ نیکی اور بدی کے متضاد اوصاف کے حامل ہیں۔ لیکن نیکی اور بدی کا امتزاج ہر شخص میں مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک کی نیکیاں اور بدیاں دوسرے کی نیکیوں اور بدیوں سے مکمل طور پر مشابہ نہیں ہوتیں۔ بعض اشخاص میں نیکی، بدی پر اس طرح غلبہ پا لیتی ہے کہ بدی کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایسے اشخاص

بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگوں میں بدی نیکی پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ ان کی نیکی ظاہر نہیں ہو پاتی۔ ظاہر ہوتی بھی ہے، تو غور سے دیکھنے پر وہ نیکی بھی دراصل بدی ہی ہوتی ہے، جس نے نیکی کا روپ اختیار کیا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کا کوئی شمار نہیں۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ ان کے کردار میں کبھی نیکی نظر آتی ہے اور کبھی بدی لیکن انسانی معاشرے میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی جبلّت میں وحشت و بربریت ہوتی ہے، یہ حیوان ہیں یا درندے۔ ان کا وجود، ان کی زندگی اور ان کی موت سب انسانیت کے لیے باعث ننگ ہیں۔

جہاں تک ملکی نظم و نسق کا تعلق ہے، بادشاہ کے دربار کا سابقہ پوری رعایا سے پڑتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ بادشاہ اپنے متضاد اوصاف، یعنی خوف اور مہربانی، دبدبہ اور شفقت، طاقت اور نرم دلی، کبر و انکسار، سختی اور نرمی، غصہ اور رحم، فیاضی اور قساوتِ قلبی کی پوری پوری تہذیب و تربیت کرے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ان اوصاف کو بروئے کار لائے۔ سیرت کی تربیت کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ وہ مخلوقات سے عہدہ برآ ہو سکے جو اپنے اخلاقی اوصاف، سیرت، طبیعت اور فطرت میں جدا جدا ہیں۔ اور پھر اگر بادشاہ میں صرف خوف ہی خوف ہو، مہربانی نہ ہو تو جو لوگ اطاعت کیش فرماں بردار اور لاچار ہوں گے، وہ ایسے بادشاہ کی حکمت عملی کا ساتھ کیوں کر دے سکیں گے جو ظلم و تشدد پر مبنی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر بادشاہ میں رحم ہی رحم ہو، تشدد نہ ہو تو وہ باغیوں، سرکشوں اور نافرمانوں کی سرکوبی کیونکر کر سکے گا۔ محض مہر و محبت ایسا ذریعہ نہیں کہ وہ انھیں اطاعت کیش اور فرماں بردار بنا سکے۔ پس بادشاہ کے متضاد اوصاف کا کامل طور پر تربیت یافتہ ہونا اور حسبِ موقع ان کا بروئے کار آنا لازم ہے۔

واز اعجب العجائب آفرینش باشد کہ اوصاف متضادہ بکمال بود و در محل شایان و شائستہ جلوہ کند و نہ قہر در محل لطف صرف شود، و نہ لطف در موضع قہر مشاہدہ افتد و ایں چنیں موصوفی را از اخلاق خدائی حظی و نصیبی تمام باشد۔

شاہانِ اسلام جو دین کے سچے پیرو، سیرت کی خوبیوں کے حامل اور ایمان راسخ سے

متصف ہوتے ہیں، وہ رعایا سے سلوک کرنے میں مہربانی اور تشدد، غصہ اور رحم، طاقت اور نرم روی، سختی اور نرمی صرف خدا کی خوشنودی اور سنت نبوی کی پیروی کے لیے کرتے ہیں۔ اپنی قوت اور سطوت کا استحکام بھی وہ اسی لیے چاہتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی بادشاہ ہیں جو سیرت کی خوبیوں سے بے بہرہ ہیں۔ بدیاں ان کی نیکیوں پر غالب ہیں۔ ایمان پر ان کا یقین پختہ نہیں۔ ان کی ظاہری خوبیاں محض ان کی حکمت عملی اور مصلحت کا نتیجہ ہیں۔ ان کا مقصد دنیا میں ذاتی خوش حالی اور طاقت حاصل کرنا ہے۔ اگر کبھی وہ مہربانی کرتے ہیں تو ان کی مہربانی ذاتی منفعت کے لیے ہوتی ہے۔ اگر تشدد کرتے ہیں تو وہ بھی ذاتی مفاد کی غرض سے، انعامات کی بارش کرتے ہیں یا تحمل ظاہر کرتے ہیں یا لوگوں کو پریشان کرنے سے ہاتھ روکتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ وہ شریعت کی پیروی کرتے ہیں بلکہ اپنی اور اپنی حکومت کی بقاو حفاظت کے لیے۔ دونوں صورتوں میں وہ خدا کے حضور جواب دہ ہوں گے اور برکات خداوندی سے محروم رہیں گے۔

برنی سلطان محمود کے حوالے سے لکھتا ہے:

اے ۵۹ فرزندانِ محمود! ..... بہ تکلف رذائلِ خود بفضائل تغیر کنید، کہ آدمی را قابلِ تغیر اخلاق آفریدہ اند و اگر دیگری تغیر اخلاق کند یا نکند اما بادشاہ را، کہ اخلاق متضادہ او بر ہمہ جہان ساریست، بی تغیرّ اخلاق بادشاہی کردن میسر نشود و از تاثیر رذائل اخلاق دین و دنیا مبتر گردد۔"

یعنی انسان کو اخلاق میں تبدیلی پیدا کرنے پر قادر کیا گیا ہے اس لیے سعی و کوشش سے اپنے رذائل کو فضائل میں تبدیل کرنے کی کوشش کرو۔ کوئی دوسرا اخلاق میں تغیر پیدا کرے یا نہ کرے بادشاہ کے لیے، کہ اس کے متضاد اخلاق پوری مملکت پر جاری و ساری ہوتے ہیں، انھیں مہذب بنائے بغیر حکومت کرنا ممکن نہیں ہوتا اور پھر رذائل سے دین و دنیا دونوں میں ابتری بھی ہوتی ہے۔

حوالے: ۵۱ سورہ: ۷، آیت: ۲ ۵۲ مخطوطہ، ورق ۱۴۰ب و ۱۴۱ ا ۵۳ ایضاً، ص ۱۵۷ ا — ۵۴ ایضاً، ص ۱۵۸ ا ۵۵ ایضاً، ص ۱۵۹ ا ۵۶ ایضاً، ص ۱۵۹ب ۵۷ دیکھیے تاریخ فیروز شاہی۔ مؤلفہ ضیاء الدین برنی، بہ تصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید، ج ۱، ص ۲۸۲ تا ۲۸۹ ۵۸ مخطوطہ، نصیحت ۱۸، ورق ۱۹۴ب ۵۹ ایضاً، نصیحت ۱۸ ورق ۱۹۸ ب۔